تحریک عاشورہ کے تاریخی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی عوامل

مؤلف: محمد رحیم عیوضی
مترجم: مولانا سید منظر صادق زیدی

اس مقالہ کے دو سوالات کا جواب ہمارے لیے تحریک عاشورہ کے تاریخی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی اسباب وعوامل کے تجزیہ میں مدد گار ہو گا۔

پہلا سوال یہ ہے کہ یہ واقعہ کیوں پیش آیا؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ اس قیام کے تاریخی اسباب کیا تھے؟ اور یہ واقعہ کیسے رونما ہوا؟ پہلا سوال زیادہ اہمیت کا حامل اور بنیادی ہے۔ اس مقالہ کا مقصد واقعات کی تشریح یا ان کو محض بیان کرنا نہیں ہے بلکہ واقعات کو اس انداز سے پیش کیا جائے گا کہ وہ اس واقعہ کے اسباب وعوامل کو سمجھنے میں معاون ہو سکیں۔

سر سری جائزہ کے بعد یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ۲۸ صفر ۱۱ ہجری میں پیغمبر اکرمؐ کی رحلت کے بعد امت مسلمہ کی قیادت ورہبری اس سلسلہ میں آنحضرتؐ کے فرمودات کو نظر انداز کیے جانے اور آپؐ کے نظریہ کے بمقابل سقیفہ میں کیے گئے فیصلہ کے سبب انحراف کا شکار ہو گئی۔

دعوت کے ابتدائی دور کی بہ نسبت اسلامی معاشرہ وسیع ہو چکا تھا اور مسلمانوں کی تعداد میں بھی کافی زیادہ اضافہ ہو گیا تھا لیکن معاشرہ میں ابھی پختگی نہیں آئی تھی اور جس طرح اسلامی اصول کو قلب ودماغ میں پیوست ہونا چاہئے تھا ابھی ایمان اس طرح دلوں میں راسخ نہیں ہوا تھا۔ دراصل لوگوں نے اکثریت کی پیروی میں اسلام قبول کر لیا تھا چونکہ ان کے لیے اب اسلام قبول کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔

اس دور میں لوگوں کی اکثریت نے اسلام قبول تو کر لیا تھا لیکن اس کی کوئی مستحکم بنیاد نہیں تھی۔ امت مسلمہ کے سامنے پیغمبر اکرمؐ اور آپؐ کے مخلص اصحاب کی بھرپور قوت کے ساتھ ہمدردانہ مجاہدت کے نتیجہ میں دھیرے دھیرے نئے دریچے کھلتے جا رہے تھے لیکن انہیں اچھی طرح سمجھنے اور اپنی زندگی میں برتنے یا آزمانے کا

موقع نہیں ملا تھا بلکہ ان اصولوں کے قلب و دماغ میں راسخ ہونے میں ابھی کافی وقت درکار تھا جبکہ انحراف کے تمام راستے کھلے ہوئے تھے۔

پیغمبر اکرمؐ کی وفات کے فوراًبعد یہ صورت حال پیش آئی اور اسلام کے پرچم تلے امت مسلمہ کی رہبری کے لیے ہونے والا اجتماع اس انحراف کا سب سے واضح نمونہ تھا۔ اس اجتماع میں دور جاہلیت کے افکار دوبارہ ابھر کر سامنے آگئے اور اسلامی معاشرہ کی ہدایت کے منصب کو حاصل کرنے کے لیے قبایلی فضائل اور فخر ومباہات کو بطور دلیل پیش کیا گیا۔

انہیں نقائص و دقت نظر کی قلت اور دوراندیشی سے مبرا خیالات نے اس دور کے اسلامی معاشرہ میں دین اسلام کے اصول و نظریات کے راسخ ہونے کے مواقع پر نہایت منفی اثر ڈالا اور دور جاہلیت کی پژمردہ ثقافت کو ایک نئی زندگی حاصل ہوگئی۔ یہ صورت حال تیسرے خلیفہ کے دور میں اس عروج پر پہنچ گئی کہ لوگوں کی شورش کے نتیجہ میں ان کا قتل ہوگیا۔

قتل عثمان سے نہ صرف یہ کہ کوئی مسئلہ حل نہ ہوسکا بلکہ جن کے دل اسلام اور بنی ہاشم کے کینہ سے لبریز تھے ان کو ایک اور بہانہ ہاتھ آگیا، چنانچہ معاویہ نے پیغمبر اکرمؐ اور آپکے پیروکاروں کی سیرت وسنت سے مقابلہ کے لیے اس موقع کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اور دور جاہلیت کے وہی افکار جن کی جڑیں دلوں میں موجود تھیں اس نے انہیں کے بل بوتے پر اپنی حکومت کی بنیادوں کو مزید مضبوط کرلیا۔ وہ لوگوں کی جہالت سے فائدہ اٹھاکر حکومت اور طاقت کے حصول کی راہوں پر آگے بڑھتا رہا۔[1]

ایسی کشمکش اور ٹکراؤ کی صورتحال نے بیمار اسلامی معاشرہ کو اور کمزور بنادیا، حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد معاویہ کی جسارتوں میں مزید اضافہ ہوگیا اور اس نے اپنی طاقت کے بل بوتے پر اپنے کو خلیفہ مسلمین قرار دے دیا۔

۱۔ جعفری، حق و باطل، ص ۴۵، ۱۳۷۸ھ ش

اس پر فتن دور میں فریب کاری اور دورخی پالیسی زیادہ کامیاب تھی جس کے نتیجہ میں اسلامی امت، عادات واطوار کے لحاظ سے اسلام سے دور ہوتی چلی گئی۔ انہیں حالات کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اس نے امام حسن علیہ السلام کو خاموش کرنے کی کوشش کی اور بالآخر آپؑ کو صلح کے لیے مجبور ہونا پڑا۔ اگرچہ دیگر فریب خوردگان دولت وحکومت کی طرح اس کا خیال بھی یہ تھا کہ وہ ہدایت وامامت کی شمع کو خاموش کردے گا لیکن اسے یہ خبر نہیں تھی کہ خدا کا ارادہ اور اس کی مشیت کچھ اور ہی ہے۔

صلح نامہ کے مشمولات کو پڑھنے کے بعد یہ صاف واضح ہو جاتا ہے کہ آخر کار یہ صورت حال معاویہ کے لیے ہی نقصان دہ ثابت ہوئی اور اس سے بنی امیہ کی ذلت ورسوائی کا آغاز ہو گیا خاص طور سے معاویہ کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد اور امام حسین علیہ السلام کے قیام کی بدولت۔

یہ قیام رسالت کا تسلسل تھا کیونکہ رسول خداؐ نے خود فرمایا ہے: ”حسین منی وانا من الحسین“ اب رسول خداؐ نے خود کو امام حسینؑ سے کس طرح فرمایا؟ اس کی تشریح یہ کی گئی ہے کہ رسالت کے بعد پیغمبرؐ ایک فرد شمار نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ نمونۂ عمل، آئیڈیل اور علامتی شخصیت کی حیثیت کے مالک تھے کہ جن کے وجود پر نور میں رسالت اپنے تمام تر پہلوؤں کے ساتھ متجلی ہوئی ہے۔ آپؐ کی ”حیات طیبہ ہی رسالت“ اور آپؐ کی ”رسالت ہی آپ کی عین زندگی“ تھی۔[۱]

ہر رات کا خاتمہ یقینی ہے اور امیر شام کے نفاق اور فتنوں کی اندھیروں سے بھری رات اس کی موت پر ختم ہو گئی۔ وہ ابتدائی شگاف اور رخنہ جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مزید وسیع ہو گیا تھا اس کے باعث جاہل افراد تبلیغ اسلام کی مسند پر قابض ہو گئے اور ایسے افراد اپنے نفسانی مفادات ومنافع کو جاہل اور بے خبر عوام کے سامنے اسلام کے ”مسلم اصولوں“ کی شکل میں پیش کرتے رہے۔ معاویہ جیسے افراد کے ذریعہ اپنایا جانے والا یہ سلسلہ خلفاء کے دور سے ہی جاری تھا اور اس کے لیے مختلف اقدامات بھی کئے گئے تھے۔

۱۔ الحسینی الجلالی، الحسین سماتہ وسیرتہ، بی تا

ان اقدامات کا نتیجہ معاویہ کے دور حکومت میں سامنے آیا اور اسلام کی بساط بالکل الٹ کر رہ گئی یعنی نیکی کو برائی اور برائی کو نیکی قرار دے دیا گیا۔ جب معروف (نیکی) کو منکر (گناہ)، اور منکرات کو معروف سمجھا جانے لگا تو گویا اسلام کے طاق نسیان ہونے کا وقت قریب آ چکا تھا۔

یزید بن معاویہ کی خلافت بلکہ صحیح تعبیر کے مطابق اس کی "سلطنت" کے آغاز کے ساتھ ہی اموی حکومت کا اصل چہرہ ظاہر ہو گیا اور جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی اور پانی سر سے اونچا ہو گیا تو "باطل" کے مقابلہ میں "حق" بھی بالکل آشکار ہو کر سامنے آ گیا اور امام حسینؑ کا قیام اپنی تمام تر طاقت اور قوت کے ساتھ ان کے مظالم، پستی اور ذلت کے مد مقابل عالم میں آشکار ہو گیا اور کربلا کے دشت میں حق و باطل کا ایسا معرکہ پیش آیا کہ جس نے زمان و مکان کی حدود سے بلند ہو کر باطل کی بنیادوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پوری کائنات میں ہلا کر رکھ دیا اور گمراہیوں کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں آزادی خواہ اور حق طلب تحریکوں کے لیے مرکزی نقطہ اور ستارۂ ہدایت میں تبدیل ہو گیا۔[1]

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کی بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ صدر اسلام کے نشیب و فراز کی تاریخ پر ایک سرسری مطالعہ سے یہ بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے فرامین اور خطرات سے متعلق آپؐ کی نشاندہی سے غفلت اور انہیں نظر انداز کر دینے کی بناء پر انحراف کی جڑیں مضبوط ہوتی چلی گئیں۔ اس کی ابتداء تو اس نقطہ سے ہوئی کہ جب ہدایت اسلامی کا نظام اس کے اہل کے ہاتھوں سے چھین لیا گیا اور پچاس سال کے بعد آہستہ آہستہ (یہ انحراف اتنا بڑھا کہ) اسلامی حقیقت کے مظہر یعنی امام کو ہی گھوڑوں کی ٹاپوں کے نیچے پامال کر دیا گیا تاکہ واضح اور مکمل طور پر اس کی مخالفت کا اظہار ہو سکے۔

اب ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کار وہ اسباب و عوامل کیا تھے جن کی بناء پر امت مسلمہ کے امام کا سر مسلمانوں کے ہاتھوں قلم ہو گیا اور امت نے اس کے خون کو حلال سمجھ لیا۔

۱۔ محمد رحیم عیوضی، ص ۷۸، ۱۳۸۱

واقعہ عاشورہ کربلا سے پہلے وہ کون سے تاریخی، سیاسی، سماجی اور حتی ثقافتی حالات پیدا ہو گئے تھے کہ جن کی بنا ءپر اتنی بڑی تباہی رونما ہو گئی کہ دور جاہلیت کی رسومات و تہذیب دوبارہ زندہ ہو گئی ؟۔

پیغمبر اکرمؐ کا دور (موجودہ صورتحال، مطلوبہ تبدیلی)

پیغمبر اکرمؐ جن تبدیلیوں کے خواہشمند تھے وہ وہی تبدیلیاں تھیں کہ جنہیں "مقصد بعثت" کہا گیا ہے۔ یہ اہداف و مقاصد ایک اعتبار سے قیامت تک آنے والے ہر دور کے لیے کلی اصول اور قوانین پر مشتمل تھے اور دوسری جانب وہ اس دور کے حالات سے بھی تناسب رکھتے تھے۔ انبیائے کرام کی بعثت کے مختلف مقاصد بیان کیے گئے ہیں جن میں سے کچھ یہ ہیں: توحید اور قیامت کی طرف دعوت، معاشرہ میں عدل وانصاف کا قیام، سماجی انصاف، کتاب وحکمت کی تعلیم۔ ان تمام اقدامات کا اصل مقصد انسان کو اس کی اصل عزت وشرف کی جانب متوجہ کرنا اور ترقی کی راہ پر گامزن کرنا ہے اور یہ کہ انسان کائنات کو "الٰہی جلوہ" کا ایک مجموعہ سمجھ کر اس میں اپنا مقام ومرتبہ تلاش کرے اور آخر کار وہ حق تعالیٰ کی عبودیت اور بندگی کے راستہ پر لگ جائے۔

پیغمبر اکرمؐ کے دور میں جو کچھ تھا اور آپؐ نے جس کے اصلاح کی کوشش کی تھی قرآنی ثقافت میں اسے "جاہلیت" کا نام دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں لفظ "جاہلیت" متعدد مواقع پر استعمال ہوا ہے اور اس سے مراد ہر "وہ رسم ورواج ہے جو قرآن کریم کے معیار اور اصولوں کے بر خلاف ہو"۔ کتب لغت میں بھی "جاہلیت" کے بارے میں یہ کہا گیا ہے "جو لوگ خدا و پیغمبر اور آسمانی شریعتوں کے بارے میں جاہل تھے، اپنے آباؤ اجداد پر فخر ومباہات کرتے تھے اور تکبر وغرور ان کی عادت تھی ایسے افراد کو جاہل کہا جاتا تھا۔"

جاہلیت کے رسم ورواج دراصل ناپسندیدہ اور پست صفات کا نتیجہ تھے۔ عبدالرحمن بن خلدون نے اپنی کتاب "العبر" میں عربوں کی متعدد مذموم صفات بیان کی ہیں جو سب کی سب جاہلیت، قرآنی اصولوں کے سراسر خلاف، اعمال کے استحکام میں بے حد موثر ہیں۔ یہ صفات مندرجہ ذیل ہیں:

ریاست طلبی، حب جاہ، ظلم وزیادتی، لوٹ مار، وحشی گری، سخت مزاجی، اکڑ، حق سے زیادہ کی خواہش، مقابلہ اور رقابت، تکبر اور دیگر مذموم صفات۔[۱]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپسی اختلافات، تعصب، جہالت ونادانی اور بد اخلاقی جیسے صفات ان کی انفرادی واجتماعی زندگی میں رچ بس گئے تھے اور یہی وہ چیزیں ہیں کہ جن میں بنیادی تبدیلی کے لیے پیغمبر اکرمؐ مبعوث کیے گئے ہیں۔ چنانچہ پیغمبر اکرمؐ نے اسلامی حکومت کی بنیاد رکھ کر توحید پیش کرنے کے ساتھ اس کی طرف دعوت دی، اور عقیدۂ آخرت کی یاد دہانی کرائی، اور کائنات ہستی پر قانون ونظام کی حکومت اور اس کے بامقصد ہونے کی طرف متوجہ کرکے عالم ہستی میں انسان کے مقام اور مرتبہ کی جانب متوجہ کیا تاکہ آپسی تفرقہ اور تعصب کو اخوت وبرادری اور جہالت ونادانی کو علم دوستی اور حصول علم کے شوق میں تبدیل کردیں، اخلاق حسنہ کو موجود بداخلاقی کا بدل قرار دیں۔ یہ اقدامات انسانوں پر اتمام حجت کے لیے انجام پاتے تھے۔

اس گفتگو کے آخر میں جس نکتہ کی مزید وضاحت کی ضرورت ہے وہ اسلامی حکومت کی تاسیس کے سلسلہ میں پیغمبر اکرمؐ کے اقدامات کا تذکرہ ہے۔ یعنی اس سلسلہ میں آنحضرتؐ کے پیش نظر بیک وقت دو اہم مقاصد تھے:

۱۔ معاشرہ کے سماجی امور کو منظم کرکے ایک باقاعدہ نظام قائم کرنا

۲۔ معاشرہ کے امور میں "ہدایت" کے عناصر کو شامل قرار دینا

ایسے معاشرہ کے معروف اور منکر قرآنی ہوتے ہیں، اور ایسا معاشرہ "جاہلیت" کی حالت سے نکل کر مطلوبہ "قرآنی سمت" میں اپنا سفر جاری رکھ سکتا ہے۔

خلفائے ثلاثہ کا دور (موجودہ صورتحال ومطلوبہ تبدیلی)

اسلامی احکام اور شعائر کو استحکام اور دوام عطا کرنے کے لیے رسول اکرمؐ نے جو کوششیں کی تھیں وہ آپؐ کی وفات کے بعد موقوف ہوگئیں اور آپؐ کے بعد اس مہم کو آگے بڑھانے والے "لائق" اور "اہل افراد" کی ضرورت

۱۔ مقدمہ ابن خلدون، ۷ ۱۳، ۱۳۶۶

شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ اس سلسلہ میں پیغمبر اکرمؐ نے اپنی عملی سیرت کو دین اسلام کے کار آمد ہونے کے بارے میں جس کے مثبت نقوش امت کے دلوں میں موجود تھے، اس سیرت کے علاوہ آپؐ نے چند اقدامات بھی فرمائے تھے جیسے: حضرت علیؑ کو اپنا جانشین معین فرمایا۔ حدیث ثقلین ارشاد فرمائی۔

لیکن جو کچھ سامنے آیا وہ سب آنحضرتؐ کی نصیحتوں اور ارشادات کے برخلاف ہی تھا۔ اس لئے کہ جاہلیت کے رسم ورواج بآسانی ختم ہونے والے نہیں تھے۔ کیونکہ ایک جانب تو ان کی تاریخ کافی قدیم تھی اور صرف دو دہائیوں کے اندر، جو ایک انسان کی طبیعی عمر بھی نہیں ہوتی ہے، ان کو ختم کرنا ممکن نہیں تھا۔ دوسرے یہ کہ اس تہذیب کو ایسے منابع سے غذا ملتی ہے جن کی بنیاد انسانی نفسیات ہوتے ہیں اور ان نفسیات کو جس دور میں بھی کنٹرول نہ کیا جائے تو جاہلی تہذیب وتمدن قرآنی اصولوں کے برخلاف خود بخود بڑھنا شروع کر دیتی ہے۔ اسی بناء پر پیغمبر اکرمؐ کے بعد آہستہ آہستہ پھر سے دور جاہلیت کے رسم ورواج ظاہر اور مستحکم ہونے لگے۔ یہی وجہ تھی کہ اس غلط اور "عہد جاہلیت" کی طرف لے جانے والے فیصلہ کی بنیاد سقیفہ میں رکھی گئی تھی۔ کیونکہ قرآن کے سب سے اہم حامی اور امت کے عظیم ہادی یعنی "امام" کو نظر انداز کرنا سب سے پہلا بنیادی اور پائیدار انحراف تھا۔

دو سال اور کچھ مہینے پہلی خلافت، دس سال اور چھ مہینے دوسری خلافت اور تقریباً بارہ سال تک تیسری خلافت کے ہاتھوں میں امت مسلمہ کی زمام حکومت رہی۔ ہمارا مقصد محض تاریخی واقعات کو نقل کرنا نہیں ہے بلکہ ہم واقعات کے ضمن میں واقعہ کربلا کے رونما ہونے کے اسباب وعوامل کا تذکرہ کریں گے اور ان دگرگوں حالات کا تجزیہ کریں گے جن کی بدولت اسلامی معاشرہ اس پستی تک پہنچ گیا کہ امام حسین علیہ السلام کو اس کے خلاف قیام کرنا پڑا۔

انحرافات کی بنا پر تبدیلیاں جس انداز سے سامنے آئیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ: امام کو منصب امامت سے دور کر دیا گیا، قرآن مجید کی تفسیر پر توجہ نہیں کی گئی، تفسیر کے بغیر "نص قرآن" کے بالمقابل ذاتی رائے اور "اجتہاد" سے کام لیا گیا، احکام قرآن کی جانب سے بے اعتنائی، دینی امور میں غیر عالموں (ناواقف افراد) کی مداخلت، اصل (قرآن) پر فرع (حدیث) کو فوقیت دی گئی، جعلی حدیثوں کا بازار گرم ہو گیا۔

تینوں خلفاء کے زمانہ میں جو کچھ رونما ہوا وہ "قرآن مجید" کا مومنین کی سماجی اور معاشرتی زندگی میں نظر انداز کیا جانا تھا اور اسی بنا پر "سنت" کی بھی اہمیت نہ رہ گئی جبکہ "سنت" اسلامی شریعت اور "شعائر دینی" کی مجسم شکل تھی جس کا نتیجہ بعد میں جعلی حدیثوں کی شکل میں سامنے آیا، پیغمبر اکرمؐ کی واضح سیرت کے باوجود ذاتی رائے کو مذہب کے نام سے پیش کیا جانے لگا اور مسلمانوں کے درمیان "قرآنی معروف" اور "منکرات" کے اثرات خود بخود کم رنگ ہوتے چلے گئے۔

انحراف کے آغاز و ارتقاء کو اگر حدیث ثقلین کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ بات بالکل واضح نظر آتی ہے کہ الٰہی راہ فلاح وہدایت سے انحراف اس بنا پر شروع ہوا کہ پیغمبر اکرمؐ کے دو قیمتی تحفوں کو امت نے بالکل فراموش کر دیا تھا اس لیے دور جاہلیت کے دوبارہ آغاز اور امامت کو نظر انداز کیے جانے سے فتنہ کا آغاز ہوا۔[۱]

دور پیغمبر اکرمؐ اور دور حکومت امیر المومنین میں مماثلت

پیغمبر اکرمؐ کے دور میں "تبدیلی" کی بنیاد یہ تھی کہ معاشرہ پر مسلط دور جاہلیت کے رسم ورواج کو تبدیل کر دیا جائے۔ ہمیں بخوبی معلوم ہے کہ جب کوئی انقلاب یا تبدیلی رونما ہوتی ہے تو اس غبار آلود اور ناامن ماحول میں "فتنہ" کی فضا ہموار ہو جاتی ہے جو کہ قائدین امت کی فکری صلاحیتوں اور تجربات کے اعتبار سے مفید، تعمیری، یا مضر اور نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کو بھی اپنے دور میں معاشرہ پر مسلط رسم ورواج کی بنیادی اصلاح کی فکر لاحق تھی لیکن آپؑ کا دور، پیغمبر اکرمؐ کے دور سے مختلف تھا کیونکہ پیغمبر اکرمؐ کے دور میں دھیرے دھیرے لوگ اسلام کے حامی اور اسلام کے مخالفین دو الگ الگ گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے اور ان کی شناخت نہایت آسان تھی لیکن جب مولائے کائنات کا دور آیا تو پیغمبر اکرمؐ کے زمانہ میں جو جاہلیت اور جاہلی اقدار کے رسم ورواج دم توڑ رہے تھے وہ اقلیت سے ابھر کر پھر اکثریت کی شکل اختیار کر گئے۔ (جن کے اسباب پہلے ذکر کئے جا چکے ہیں) بلکہ

۱۔ علامہ مرتضی عسکری، ۷ ۔ ۳ ۔ ۸ ۔ ۳ ۔ ۹ ۔ ۷ ۔ ۱۳

اس بار تو انہوں نے ایک ایسی نئی شکل اختیار کی جس کا پہلے کوئی نام ونشان نہیں تھا یا اگر تھا بھی تو بہت کم نظیر تھا۔ چنانچہ ایسی صورت میں مخالفین اور موافقین (دوست و دشمن) کی شناخت کرنا بے حد دشوار تھا۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں نے خود کو مسائل سے بالکل لاتعلق بنالیا تھا جبکہ کچھ لوگ اپنے تکبر کی بنا پر خود کو عالم مطلق اور سب سے بڑا پارسا سمجھنے لگے تھے اور وہ افراط کا شکار ہوگئے۔ ایسی صورتحال میں کرسی اور اقتدار کے حریص افراد ان حالات کے مدنظر لوگوں کی "جہالت" اور "تعصب" کا غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے حکومت پر اپنا قبضہ جمانے کے لئے امیر المومنین کے مقابلہ پر سرگرم ہوگئے۔[۱]

اس طرح ان دونوں ہی حضرات کے دور کی مشترکہ صورتحال معاشرہ پر حاکم ثقافت یعنی رسم ورواج کو "تبدیل" کرنے کی ضرورت تھی۔ لیکن ان دونوں کے درمیان فرق یہ تھا کہ مولائے کائنات کے دور میں الگ قسم کے عقائد ونظریات پائے جاتے تھے جس کی بنا پر پیغمبر اکرمؐ کی سنت کے احیاء میں آپؑ کو سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ قوم کی ساری فکری توانائی تو "جہالت" اور "تعصب" کی نذر ہوچکی تھی اور اب امت کی قیادت کے سامنے ایک ہی راستہ باقی رہ گیا تھا کہ وہ طاقت اور تنبیہ کے زور پر ہدایت کا فریضہ ادا کرے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن مجید کے اصولوں کو معاشرہ میں ثابت واستوار کرنے کے لیے سازگار ماحول فراہم نہ ہوسکا۔

امامؑ کی نظر میں معاشرہ کی زندگی اور موت کا کل دارومدار معاشرہ میں قرآن کی موجودگی یا عدم موجودگی پر تھا اور آپ کی نظر کے مطابق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے وسیع پیمانہ پر عمل دخل کی ضمانت صرف اس صورت میں فراہم ہوسکتی تھی کہ جب معاشرہ قرآنی اصولوں کا صدق دل سے احترام کرتا ہو۔

بطور مثال نہج البلاغہ کے خطبہ نمبر ۱۱۳ کی جانب اشارہ کیا جاسکتا ہے کہ جس میں آپؑ نے ارشاد فرمایا: "افسوس تمہارے دلوں سے موت کی یاد نکل گئی ہے اور جھوٹی امیدوں نے ان پر قبضہ کرلیا ہے۔ اب دنیا کا اختیار تمہارے اوپر آخرت سے زیادہ ہے اور وہ عاقبت سے زیادہ تمہیں کھینچ رہی ہے، تم دین خدا کے اعتبار سے بھائی بھائی تھے لیکن تمہیں

۱۔ محمد رحیم عیوضی، ۸۶، ۱۳۸۱

باطن کی خباثت اور ضمیر کی خرابی نے الگ الگ کر دیا ہے کہ اب نہ کسی کا بوجھ بٹاتے ہو، نہ نصیحت کرتے ہو، نہ ایک دوسرے پر خرچ کرتے ہو، نہ ایک دوسرے سے واقعاً محبت کرتے ہو۔"

خطبہ نمبر ۱۴۷ اور ۱۵۴ میں آپ تاکید فرماتے ہیں کہ: "یاد رکھو! میرے بعد تمہارے سامنے وہ زمانہ آنے والا ہے جس میں کوئی شی حق سے زیادہ پوشیدہ اور باطل سے زیادہ نمایاں نہ ہو گی۔" یہاں تک کہ "یہ لوگ فتنوں کے دریاؤں میں ڈوب گئے ہیں اور سنت کو چھوڑ کر بدعتوں کو اختیار کر لیا ہے۔"

مولائے کائنات کے دور میں رائج بدعتیں، جعلی سنتیں اور قرآنی اصولوں کی پامالی یہ وہ تین بنیادی اسباب تھے جن کے مقابلہ کے لیے امیر المومنینؑ کو طعنے سہنے پڑے اور جنگ جمل، صفین اور نہروان جیسی تین جنگیں لڑنی پڑیں۔

یہی وجہ ہے کہ جتنی قسم کی مخالفتیں تھیں امام علی علیہ السلام نے ان سب کا مقابلہ کیا چاہے وہ بیعت توڑنے والے ہوں، غالی (اہل افراط) ہوں یا حکومت کے لالچی افراد۔

امام علیہ السلام نے قصاص کا مطالبہ کرنے والوں کو نظر انداز کر کے قرآن و سنت کے مخالفین سے نہ صرف یہ کہ تین جنگیں لڑیں بلکہ قرآن مجید کے احکامات کو عملی شکل میں پیش کر کے پیغمبر اکرمؐ کی زندگی کے ماحصل کو تقویت عطا فرمائی اور انحرافات کی اصلاح کرنے کے لیے حد درجہ کوشش کی۔

امام حسن علیہ السلام کا دور (موجودہ صورتحال، مطلوبہ تبدیلیاں)

پیغمبر اکرمؐ کی وفات تاریخ کا اہم موڑ تھی کیونکہ اس کے بعد پلڑا مخالفین کی جانب جھک گیا تھا اور پہلا ہی شگاف آئندہ اقدامات کے لئے مناسب مقدمہ ثابت ہوا۔ سنت اور اہل بیتؑ کو نظر انداز کیا گیا جس کے نتیجہ میں قرآن یکسر بے دخل ہو گیا اور اس طرح ہدایت کے حیات بخش چشموں کو بند کر کے حقیقی مسلمانوں کی پرورش میں رکاوٹ پیدا کر دی گئی جس کے نتیجہ میں اسلام صرف برائے نام رہ گیا اور بطور عادت اس کے صرف چند آداب رائج کر دیئے گئے۔ نام نہاد اسلام قدرت پرستوں کے ہاتھوں کا کھلونا بن گیا تاکہ وہ اس بے معنی اور بے جان شریعت کے ذریعہ لوگوں پر مظالم ڈھا سکیں۔ وہ لوگ اپنے مقاصد کے لیے ہر چیز کو سیڑھی کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ آہستہ

آہستہ یہ گروہ آگے بڑھتا رہا اور امام حسنؑ کے زمانہ میں اس نے اپنے دائرہ کو نیرنگ اور مکر و فریب کے ذریعہ مزید وسیع کرنا چاہا جبکہ اس کے چہرہ پر اسلامی نقاب پڑی ہوئی تھی۔

امام حسن علیہ السلام نے پیغمبر اکرمؐ کی آغوش مبارک میں حقیقی اسلامی تربیت پائی تھی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آپؑ نے مختلف فتنوں اور گروہوں کو نزدیک سے دیکھا تھا، لوگوں کے عادت واطوار سے آپؑ بخوبی واقف تھے اور آپؑ اسلامی معاشرہ کے فکری اور سیاسی جغرافیہ کے خطوط بخوبی معین کرسکتے تھے۔

مولائے کائناتؑ کی شہادت کے بعد معاویہ کی جسارتیں بہت زیادہ بڑھ گئی تھیں کیونکہ حضرت علیؑ کے دور حکومت میں جنگوں اور آپسی ٹکراؤنے اسلامی اصول واقدار کو عملی شکل میں پیش کرنے کا کوئی موقع ہاتھ نہیں آنے دیا اور قرآنی معروف ومنکر اسی طرح گوشہ گمنامی میں پڑے تھے جس کی بناء پر عوام کی جہالتوں میں مزید پختگی آگئی جس کا ایک نمونہ یہ ہے کہ جناب مالک اشتر کے نام امیر المومنینؑ کا فرمان کاغذ پر ہی لکھا رہ گیا اور اس کے نفاذ اور اسے عملی شکل دینے کی نوبت نہ آسکی۔

ایک جانب اہل بیتؑ کی غربت ومظلومیت اور معاشرہ میں ان کی کما حقہ شناخت نہ ہونا اور دوسری جانب ائمہ معاشرہ سے الگ ہو کر کوئی اقدام بھی نہیں کرسکتے تھے ان دو چیزوں کی بناء پر دشمن سے برابر کا یعنی جیسے کو تیسا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا تھا اور اس کے لیے کسی اور تدبیر اور چارۂ کار کی ضرورت تھی تاکہ آج نہ سہی تو کم از کم کل غاصبوں کو تخت حکومت سے معزول کیا جاسکے۔ یعنی وقتی اور فوری مقاصد سے چشم پوشی کرکے ایسا طویل المدت لائحہ عمل اپنایا جائے جس کے ذریعہ بنی امیہ کی حکومت کا زوال یقینی ہو جائے۔[۱]

جب ہم ائمہ طاہرین خصوصاً امام حسنؑ کے ردعمل کو دقت نظر کے ساتھ دیکھتے ہیں تو ہمیں ان کے اقدامات میں دو اہم خصوصیات نظر آتے ہیں:

۱۔ تحمل اور صبر وحلم

۱۔ احمد زمانی، ۱۷۵، ۱۳۷۸

۲۔ حالات کی نزاکت کی شناخت یعنی موقعیت شناسی

امام حسنؑ نے بھی وہی طریقہ اختیار فرمایا جو اسلام کی حفاظت کے لیے ضروری تھا یعنی چند مہینوں کی استقامت اور صورتحال کا جائزہ لینے کے بعد یہ واضح ہو گیا کہ براہ راست مقابلہ آرائی مناسب نہیں ہے اس لیے راہ حل کے طور پر "صلح" کا راستہ اختیار کیا گیا اور "صلح" کو بھی اسی صورت میں قبول کیا گیا کہ جب امام کی نظر میں صلح نامہ کے شرائط میں مستقبل بالکل روشن تھا۔ کیونکہ دشمن کا خیال یہ تھا کہ صلح کے لیے مجبور کرنا یعنی امام حسنؑ کو گوشہ نشینی پر مجبور کرنا اور معاشرہ میں گویا اسلامی تحریکوں اور دینی طاقتوں کو یکسر پامال کر دینا۔ یہ اعتراف بجا ہے کہ اس صلح سے معاویہ کو وقتی طور پر بظاہر کافی فائدہ حاصل ہوا لیکن صلح نے اموی حکومت کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا جسے وہ ظاہری اعتبار سے لوگوں کے نزدیک اسلامی ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ معاویہ کے ساتھ امام حسن علیہ السلام کے صلح نامہ میں چار اہم نکات کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے:

۱۔ معاویہ کسی کو اپنا جانشین نہیں بنائے گا

۲۔ عوام کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے گا

۳۔ اہل بیت کے چاہنے والے اور شیعہ ہر طرح محفوظ رہیں گے انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔

۴۔ صلح کے معاہدہ کی مکمل پابندی کی جائے گی اور ہر قسم کے مکر و فریب سے پرہیز کیا جائے گا۔

اس طرح امام حسن علیہ السلام کے زمانہ کو "حدیث مکرر" کہا جاسکتا ہے کیونکہ پیغمبرؐ کی سنت کی ایک باریک نہر اپنی اصل صورت میں جاری و ساری رہی جبکہ دوسری جانب لوگوں میں بصیرت، قوت تشخیص و سیاسی شعور کی کمی، اور جذباتیت یا ظاہر بینی کہ جن سے جاہلیت کی تہذیب کو تقویت حاصل ہوتی ہے یہ سب دنیا و آخرت پر بہ یک وقت توجہ کرنے کے بجائے صرف اور صرف دنیاوی مقاصد کا مقدمہ بنتے چلے گئے۔

امام حسن علیہ السلام بھی دیگر ائمہ طاہرین کی طرح اپنے فریضۂ شرعی پر عمل پیرا تھے اور آپؑ کی جانب سے ایسا انداز اپنایا جانا ضروری تھا جس سے آپؑ تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بندگان الٰہی کے رہنما قرار پا سکیں۔ اسی لیے آپؑ اپنے "مقدس مقاصد" کے حصول کی خاطر صرف "جائز و مقدس وسائل" ہی اختیار فرما سکتے تھے۔

امام حسنؑ کی زندگی میں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ نعرے بازی، مقابلہ اور جنگوں کے تجزیہ و تحلیل کا کام "خاموشی" اور "صبر" کے تجزیہ و تحلیل کی بہ نسبت بہت آسان ہے۔ کیونکہ جنگ و جدال کے دوران طرفین بالکل واضح اور عیاں ہوتے ہیں اور ان کے لیے اپنے دعوے یا نظریات کو بیان کرنے کے حالات فراہم ہوتے ہیں لیکن جب ہر طرح سے "خاموشی" کا پہرہ ہو تو وہاں کسی چیز کا تجزیہ بے حد دشوار ہوتا ہے کیونکہ فریقین پوشیدہ رہتے ہیں اور ان کے لئے آشکار ہونے کا امکان نہیں پایا جاتا ہے۔

جس دور میں امام حسن علیہ السلام ظلم کا مقابلہ کرنے والوں کے وارث کی حیثیت سے خاموشی کو نعروں پر اور صلح کو جنگ پر ترجیح دے رہے تھے وہ دور نہایت قابل غور ہے کیونکہ فتنوں کے علاج اور دین پیغمبر کی حفاظت کی خاطر خاموشی کا اسلحہ ہی ائمہ طاہرین علیہم السلام کے حلم و صبر کے اظہار کا سب سے مؤثر طریقہ تھا۔

۵۰ ہجری میں امام حسن علیہ السلام کی شہادت سے نیمۂ رجب ۶۰ ہجری یعنی معاویہ کی ہلاکت تک تقریباً دس سال کا فاصلہ پایا جاتا ہے۔

مندرجہ ذیل چار اسباب کو امام حسنؑ کے خاموشی کی حکمت عملی پر عمل پیرا ہونے اور صلح قبول کرنے کے اہم اسباب قرار دیا جا سکتا ہے:

۱۔ تنہا ہونا اور اپنی قدر و منزلت کے اعتبار سے آپ کا نہ پہچانا جانا

۲۔ قرآنی تعلیمات کے بارے میں مسلمانوں کی عام جہالت

۳۔ حاکموں کی فریب کاریاں

۴۔ معاویہ کا مکمل تسلط اور اس کی مخالفت کا خوف

امام حسن علیہ السلام کے دور سے لے کر معاویہ کے انتقال تک معاویہ کی نیرنگیاں مذکورہ دو ستونوں کے سہارے اسے اپنا مطلوبہ نتیجہ اور ثمر بھرپور طریقہ سے دے رہی تھیں۔ پہلے معاویہ امام علی علیہ السلام سے جنگ کے

لیے مجبور تھا لیکن اس نے بعد میں دھیرے دھیرے اپنی مکاری و عیاری سے معاشرہ کے حالات اس انداز سے تبدیل کر دیئے کہ امام حسنؑ کے سامنے صلح قبول کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ رہ گیا۔

اسی صورتحال کا سامنا امام حسینؑ کو کرنا پڑا۔ اس لیے آپؑ نے بھی معاویہ کی دسیہ کاریوں کے مقابلہ میں دین کی حفاظت کے لیے خاموشی کی حکمت عملی پر عمل کیا۔ ادھر ہر روز معاویہ کی عہد شکنی کھل کر سامنے آتی رہی اور بنی امیہ کی ناجائز حکومت کے چہرہ سے نقاب الٹتی رہی۔ جس کی بدولت امویوں کی حکومت پر سوالیہ نشان لگنا شروع ہو گئے۔ امام حسنؑ کی جانب سے صلح کی قبولیت اور دس سال تک امام حسینؑ کی جانب اس کی پابندی کی کا اصل مقصد بھی یہی تھا۔ تو پھر آخر کیا ہوا کہ جس کی بنا پر کربلا وجود میں آئی؟

جیسا کہ کتاب ''خصائص الحسینیہ'' میں امام حسینؑ کے لیے سب سے پہلے مرثیہ کے طور پر سورہ بقرہ کی اس آیت کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ ''قَالُوٓا اَتَجۡعَلُ فِیۡهَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡهَا وَیَسۡفِکُ الدِّمَآءَ'' فرشتوں نے کہا: کیا تو زمین میں اسے (خلیفہ) قرار دے گا جو اس میں فتنہ برپا کرے اور خون ریزی کرے؟ حدیث میں ہے کہ فرشتوں نے کربلا میں امام حسینؑ اور آپ کے اصحاب کے مقتل کو دیکھ لیا تھا اور دلائل کے ساتھ وہ اسے سمجھ گئے تھے۔[۱]

اصل سوال اس زمانہ کے ان حالات کے بارے میں ہے کہ جن حالات کے باعث کربلا میں ایک عظیم اور ناگزیر حادثہ پیش آیا۔

حالات کی تبدیلی پر امام حسینؑ کا ردعمل

معاویہ کے انتقال کے بعد یزید نے عجلت سے کام لیا اور مدینہ کے حاکم ولید بن عقبہ کے نام دو خطوط لکھے ایک خط میں معاویہ کے انتقال کی خبر تھی جبکہ دوسرے خط میں یہ تحریر تھا۔ ''حسینؑ اور عبد اللہ بن عمر اور عبد اللہ بن زبیر سے بیعت لے لو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آنا اور جب تک وہ بیعت نہ کر لیں انھیں کسی قسم کی مہلت نہ دینا۔ والسلام

۱۔ خصائص الحسین ومزایاہ، التستری، ۱۳۰۶

یزید کے اتنے سخت اور صریح لہجہ نے امام حسینؑ کے لیے کام کو آسان بنا دیا اور آپؑ کے لیے بھی سخت اور دوٹوک انداز میں مقابلہ کا راستہ ہموار ہو گیا۔[۱]

امامؑ جب مدینہ سے مکہ کے لیے رخصت ہوئے تو آپؑ نے جناب محمد حنفیہ کے نام وصیت نامہ تحریر فرمایا تھا اس میں اپنے سفر کا مقصد بھی واضح کر دیا ہے، اس کا ایک حصہ یہ ہے۔"میں خود سری یا ہویٰ وہوس کے لیے نہیں نکلا ہوں، نہ میں نے اس مقصد کے لیے قیام کیا ہے، میرا مقصد فساد اور ظلم وستم نہیں ہے۔ میں صرف اس لئے نکلا ہوں کہ نانا کی امت میں جو خرابیاں آگئی ہیں ان کی اصلاح کروں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا اور اپنے جد وبابا علیؑ کی سیرت پر عمل کرنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا جو شخص حق کو قبول کرتے ہوئے میرا ساتھ دے وہ حق کا سزاوار ہے اور جو میرا ساتھ نہ دے تو میں صبر کروں گا یہاں تک کہ خدا میرے اور ان کے درمیان فیصلہ کر دے کہ وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے"۔[۲]

اس وصیت نامہ کو مرگ معاویہ کے بعد موجودہ حالات کی عکاسی اور مطلوبہ تبدیلیوں کا پہلا قدم قرار دیا جاسکتا ہے۔ آپؑ نے اپنے بھائی اور بنی ہاشم کو ایک تحریر میں یہ یاد دہانی کرائی تھی کہ "جو مجھ سے ملحق ہو جائے گا وہ شہید ہو گا اور جو ہم سے روگردانی کرے گا وہ کامیاب نہیں ہو سکتا ہے"۔ والسلام

قابل غور نکتہ یہ ہے کہ امام حسینؑ مکہ سے کب رخصت ہوئے۔ ذی الحجہ کے پہلے عشرہ میں، یعنی عین اس موقع پر کہ جب مسلمان حج کی تیاری کرتے ہیں امام حسینؑ مکہ کو خیرباد کہتے ہیں اور یہ بنی امیہ کی کھوکھلی شریعت پر خط بطلان کھینچنے کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

واقعاً مسلمان کتنی گہری نیند میں مبتلا تھے جو یہ سوچ رہے تھے کہ وہ اوامر الٰہی پر عمل کر رہے ہیں۔ امام حسین علیہ السلام اہل کوفہ کے نام اپنے خط میں امت مسلمہ کے رہبر کی یہ صفات بیان فرماتے ہیں۔"میری جان کی قسم! امام اور قائد صرف وہ ہو سکتا ہے جو لوگوں کے درمیان کتاب خدا کے مطابق فیصلہ کرے اور عدل وانصاف

۱۔ مہاجرانی، انقلاب عاشورہ، ص ۵۶، ۱۳۷۵
۲۔ رسول محلاتی خلاصہ تاریخ اسلام، ص ۱۶۹، ۱۳۷۷

کے لئے قیام کرے، دین حق کے راستہ پر چلے اور حکم خدا کے سلسلہ میں اپنے آپ کو حکم خدا کا پابند قرار دے"۔ والسلام۔[۱]

سفر امام حسینؑ کے دوان یہ موضوع قابل توجہ یہ ہے کہ آپؑ نے "حق انتخاب" اور "انسان کی آزادی" کو معیار "انسانیت" قرار دیا ہے۔ راستہ میں آپؑ سے جن لوگوں کی ملاقات ہوئی تھی اور وہ آپؑ سے اس سفر (قیام) کی وجہ دریافت کرتے تھے اور آپؑ جواب بھی دیتے تھے۔ لیکن جو صراحت بیان اور دوٹوک انداز آپؑ نے کربلا کے میدان میں اپنے پہلے خطبہ میں اختیار فرمایا اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ وہاں امام نے اصل مشکل کا تذکرہ فرمایا ہے یعنی "ترک سنت پیغمبر" اور "قرآن مجید کا ترک کر دیا جانا" جس کے سبب دور جاہلیت کے رسم ورواج کو تقویت حاصل ہوئی اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو طاق نسیاں کی نذر کر دیا گیا۔

امام عالی مقام نے اس خطبہ میں یہ بھی ارشاد فرمایا تھا: " لوگ دنیا کے غلام ہیں اور دین تو ان کی زبانوں پر صرف مزہ یعنی چٹخارہ کے لیے ہے کہ جب تک مزہ آتا رہتا ہے اسے استعمال کرتے ہیں اور جب امتحان کی منزل آجاتی ہے تو دیندار کم ہو جاتے ہیں۔ اب ہمارے سامنے وہ صورتحال ہے جسے تم خود دیکھ رہے ہو۔ واقعاً دنیا بدل گئی ہے اور الٹ گئی ہے اس کی خوبیوں نے پیٹھ پھیر لی ہے اور اس میں سے سوائے کُھرچن کے کچھ بھی باقی نہیں رہ گیا ہے جیسے وہ پانی جو برتن کی تہہ میں باقی رہ جاتا ہے اور اسے پھینک دیا جاتا ہے، ناپسند اور خطرناک چراگاہ کی مانند، کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ حق کتنا مظلوم ہو گیا ہے اور اس پر عمل نہیں ہو رہا ہے اور باطل کو روکا نہیں جارہا ہے ایسے حالات میں تو مومن کو خدائے سبحان کے دیدار کا خواہشمند ہونا چاہئے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں موت کو سعادت اور ظالموں کے ساتھ زندگی کو ننگ وعار کے علاوہ کچھ نہیں سمجھتا۔[۲]

۱۔ رسول محلاتی خلاصہ، تاریخ اسلام، ص ۶۰، ۱۳۷۷

۲۔ رسول محلاتی، خلاصہ تاریخ اسلام، ص ۸۲، ۱۳۷۷

اسی طرح آپؑ نے ارشاد فرمایا"علی الاسلام السلام۔۔۔" (اسلام کا خدا ہی حافظ ہے کہ جب یزید جیسا شخص اسلامی معاشرہ کا رہبر بن جائے)۔[۱]

اس مقام پر امام حسینؑ اپنے دور کی صورتحال کی وضاحت اور یہ بیان کرتے ہوئے کہ حق و باطل کی جگہیں بدل گئی ہیں ایسی صورت حال میں مومن کا فریضہ ہے کہ موجودہ صورتحال کے خلاف قیام کرے اور شہادت طلبی کے طور پر خدا کے دیدار کے لیے راغب ہو جائے (موت کو گلے لگائے)

امام حسینؑ موت کے بارے میں غور کرنے کی تاکید فرماتے ہیں۔ موت یعنی باشعور موت اور "عزت طلبی" کے رابطہ کی وضاحت فرماتے ہیں اور موت کو فرائض کی انجام دہی کی راہ ہموار کرنے، موجودہ ماحول کے حصار کو توڑ کر آئندہ کے افق کو دیکھنے کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔

آپؑ نے حر ابن یزید ریاحی کے جواب میں ارشاد فرمایا: "عزت تک رسائی اور احیاء حق کی راہ میں موت کتنی سبک اور آسان ہے! عزت کی راہ میں موت، حیات جاوید کے علاوہ کچھ نہیں ہے، اور ذلت کے ساتھ زندگی اس موت کے علاوہ کچھ نہیں ہے کہ جس میں زندگی کا نام ونشان نہ ہو"۔[۲]

ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ معاشرہ میں قرآنی تہذیب و تمدن کے فروغ اور رائج ہونے میں سب سے بڑی ثقافتی رکاوٹ معاشرہ کی ترجیحات اور حساسیت میں تبدیلی ہے۔

اس دور میں "مرجۂ" نامی طرز فکر کا رواج کہ جس کے مطابق قرآنی اقدار اور اصولوں کی قطعاً کوئی اہمیت نہیں تھی اور یہ طرز فکر، حقیقت موجود کے لیے جبر اور مقدرات الٰہیہ کی تصویر پیش کرتا تھا۔ ایسے طرز فکر کے ہوتے ہوئے چون وچرا اور معاشرہ کی "صورتحال میں تبدیلی" کی ضرورت کا احساس ہی کہاں ہو سکتا ہے۔ ایسے طرز تفکر کے ساتھ موجودہ صورتحال سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا اور شائد "موجودہ صورتحال" کو ہی "مطلوبہ

۱۔ الهادی، اخلاقیۃ النهضۃ الحسینیہ، ص ۲۵، ۱۴۱۲ھ
۲۔ آوینی، ص ۵۱، ۱۳۷۹

صورتحال"، تسلیم کرلیا گیا تھا۔ اسی لیے امام حسین علیہ السلام جو کہ اس صورتحال سے مقابلہ اور اس کے خلاف قیام کے نکلے تھے تنہا رہ گئے۔[۱]

امام عالی مقام خطرات سے لبریز اس سفر کے دوران صریح اور دوٹوک انداز میں یزید کی بیعت نہ کرنے کا اعلان بھی فرماتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ معاشرہ اور کوفہ کے لوگوں سے تاکید کے ساتھ مطالبہ کرتے تھے کہ آپؑ کی رہبری میں یزید کے مقابلہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔

اقوال امام حسینؑ کے سرسری جائزہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپؑ کے ارشادات بہت سخت ہیں لیکن ان کے اندر ظریف نکات بھی پائے جاتے ہیں۔ ایک طرف تو معاشرہ کی عمومی صورتحال اور سطح فکری کے مطابق گفتگو کرنا ہے اور دوسری جانب اس راہ میں قدم بڑھانا ہے کہ جو ہمیشہ کے لیے آزادی کے پروانوں کی راہنمائی کرسکے۔

سیاسی اور سماجی مسائل کو جبر کی عینک سے دیکھنے کا سلسلہ دراصل امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ جنگوں سے شروع ہوا اور معاویہ کے دنیا سے رخصت ہوجانے کے بعد امام حسینؑ کے دور تک معاشرہ مکمل طور پر جمود کا شکار ہوچکا تھا۔ اور معاشرہ دیگر اسباب وعوامل کے ہمراہ قرآنی معروف ومنکر قرآنی تہذیب وثقافت کی بہ نسبت بے حس وحرکت ہوچکا تھا۔ "ایمان وعمل کے درمیان کوئی تعلق نہیں" ہے، "بے عملی کے دین" کی ترویج، "بے عملی کا دین" یعنی دین کو ایک گوشہ میں رکھ دیا جائے۔ آج کی تعبیر کے مطابق "دین کو سیاست سے جدا کردیا گیا۔" سیاست اپنے وسیع معنی میں اس صورت حال کا نتیجہ حکام کے لیے بہت فائدہ مند تھا یعنی اب ان کو حکومت کے جواز کے لیے قرآنی اجازت درکار نہیں تھی۔

امام حسینؑ کا اصرار بعینہ اس نکتہ پر تھا کہ "ایمان وعمل میں پھر سے رابطہ استوار" ہونا چاہیئے۔ تاکہ ٹوٹا ہوا رابطہ پھر سے بحال ہو اور وسیع وعریض معاشرہ میں منظم طریقہ سے قرآنی معروف ومنکر کا نفاذ ہوسکے۔

۱۔ التبریزی الشبستری، ۴۲، ۲۵۷، ۱۳۵۹

شہید مطہری اپنی کتاب "احیاء تفکر اسلامی" میں اس بات پر تاکید کرتے ہیں کہ "بنیادی طور پر حسین ابن علی علیہما السلام کی شہادت کا فلسفہ یہ تھا کہ آپؑ اسلام کو عمل کے مرحلہ میں زندہ کرنا چاہتے تھے۔"[۱]

اس نکتہ کی جانب بھی توجہ رہنا چاہئے کہ مسائل کے بارے میں ایسی طرز فکر کسی دور میں بھی پائی جاسکتی ہے البتہ اس موضوع کا تعلق سماج کی تہذیبی و ثقافتی صورتحال سے ہے۔ معاشرہ کی خرابیوں کی شناخت کے لحاظ سے بھی یہ چیز قابل توجہ اور اہمیت کی حامل ہے کہ ہر دور کے مختلف سیاسی و سماجی مسائل میں ایمان و عمل کے رابطہ کا جائزہ لیا جانا چاہئے۔ "جبریہ" اور "مرجۂ" طرز فکر کی کامیابی کا ایک سبب اسلامی معاشرہ میں جعلی اور جھوٹی احادیث کا رواج اور چلن بھی تھا۔

معاشرہ میں جہاں قرآنی تہذیب و ثقافت کو وسیع پیمانہ پر رائج ہونا چاہئے تھا اس کے بجائے جعلی اور جھوٹی احادیث کے رواج نے مختلف فرقوں منجملہ "مرجۂ" کے (ان جھوٹی احادیث سے فائدہ اٹھاکر) پھلنے پھولنے کا موقع فراہم کیا۔

اس مقالہ میں پیغمبر اکرمؐ کی رحلت کے بعد منفی اور دوران جاہلیت سے متاثر اعمال و حرکات کے پس منظر میں قیام عاشورہ کے تاریخی، سیاسی، سماجی و ثقافتی اسباب و عوامل کا جائزہ لیا گیا ہے۔

سماجی مسائل کو "جبر" اور "تقدیر" کے ماتحت سمجھنا اس دور کی سب سے بڑی خرابی تھی کہ جس کا منفی نتیجہ یہ ہوا کہ سماج ان بنیادی دینی و انسانی اصول و اقدار سے دور ہوگیا کہ جو اصول اقدار پیغمبرؐ نے بطور امانت اپنے ساتھیوں کے حوالہ کیے تھے۔

دوسری جانب امام حسین علیہ السلام کا کردار "دینداری کی حقیقت" کو پیش کرتا ہے۔ انسان جبر یا کسی قہر و غلبہ کے سبب دین کو قبول نہیں کرتا بلکہ اپنے "اختیار و انتخاب" کے ذریعہ کسی دین کو مانتا ہے۔ ایسے مستحکم انتخاب کے ذریعہ کہ جو "معرفت اور تفکر" کا نتیجہ ہوتا ہے یعنی وہ نکتہ کہ جس کی قرآن کریم بے حد تاکید کرتا ہے۔

۱۔ مطہری، ص ۳۴، ۱۳۶۱

اس بات کو قبول کرنے میں ذرہ برابر پس و پیش نہیں ہونا چاہئے کہ اگر ایسے اعمال و کردار نہ ہوتے تو ہر گز وہ کربلا وقوع پذیر نہیں ہو سکتی تھی کہ جسے ہم جانتے اور پہچانتے ہیں۔

ان اعمال و کردار کو پہچاننا کہ جن کا ماحصل "کربلا" ہے تاریخ کا وہ اہم ترین تجزیہ ہے جس کے سبب بہت سے حقائق سامنے آتے ہیں جن کا خلاصہ "جاہلیت" کی جانب رجعت کے حالات فراہم کرنے میں خواص اور نمایاں افراد کی بدعنوانیاں ہیں۔ ''النّاس علی دین ملوکھم'' (یاعلیٰ سلوک ملوکھم بھی کہاجاتا ہے) یعنی حکام کی بدعنوانیوں کے نتیجہ میں عوام بھی بدعنوان ہو جاتے ہیں۔ صاحبان اقتدار اور اعلیٰ سیاسی عہدیداروں میں خرابیوں کے امکانات جس قدر زیادہ ہوں گے معاشرہ کی صورتحال اسی اعتبار سے بدتر ہوتی چلی جائے گی۔

واقعہ کربلا جہاں ایک جانب ایسے بدعنوان حکام کے خلاف احتجاج وقیام کا ترجمان ہے وہیں دوسری جانب اس حقیقت کو بھی بیان کرتا ہے کہ معاشرہ کس طرح ان بدعنوان اور ظالم حکام کا بے چون وچرا مطیع وفرمانبردار تھا۔

امام حسین علیہ السلام کا اقدام ابتدا سے انتہاء تک امت مسلمہ کی اصلاح کے لیے تھا۔ اصلاح یعنی بیداری، قرآنی معروف ومنکر کے بارے میں آگہی، جاہل تمدن کے مقابلہ میں پھر سے قرآنی تمدن کو زندہ کرنا۔

امام حسینؑ نے ترجیحات کو پہچان کر ان پر عمل کرتے ہوئے دس سال یعنی معاویہ کے دنیا سے رخصت ہونے تک ظاہری طور پر خاموشی اختیار کی یہاں تک کہ یزید خلیفہ بن بیٹھا۔ معاویہ کے رخصت ہوجانے سے یہ صورتحال کہ "صلح" فائدہ مند ہے تبدیل ہوگئی۔ اور تھوڑی ہی مدت میں صلح کو قبول کرنے کے سلسلہ میں امام حسینؑ نے جو "تدبیر" اختیار کی تھی اس کے برخلاف باطل کے مقابل واضح طور پر حق کی محاذ آرائی کے حالات فراہم ہوگئے۔

ذاتی طور پر طرفین میں سے ہر ایک کا اصرار مقابلہ کا تھا جس کے لیے بیرونی اسباب بھی فراہم تھے لہٰذا پیغمبر اکرمؐ کی رحلت کے بعد اب تک جو سیاسی، سماجی، اور ثقافتی مراحل آپؐ کی سیرت وارشادات کے برخلاف انجام پائے تھے ان سب کے نتیجہ میں کربلا اپنے تمام تر واقعات کے ساتھ رونما ہوئی اور اسے ابدی حیثیت حاصل ہوگئی۔

امام حسین علیہ السلام نے پیغمبر اکرمؐ اور اپنے پیشرو ائمہ کی سیرت پر عمل کیا آپؑ کا مقصد معاشرہ میں قرآنی تعلیمات کا نفاذ تھا۔

معاویہ کے دنیا سے گذر جانے کے بعد امام حسین علیہ السلام کے کردار واقدامات کو جو کہ اس سے قبل کے تاریخی عوامل کی بناء پر تھے مندرجہ ذیل چند نکات میں بطور خلاصہ اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ امام حسینؑ جانتے تھے کہ شہید ہوں گے۔ اور انہیں شہادت کو گلے لگانا چاہئے

۲۔ اپنا سفر جاری رکھنے یا جنگ شروع کرنے کے سلسلہ میں ہرگز اصرار نہیں فرمایا

۳۔ آپؑ اس طرح کے رویہ کا اظہار فرماتے کہ گویا اگر دعوت دینے والے پلٹ گئے تو آپؑ بھی واپس چلے جائیں گے

۴۔ امام عالی مقام کے رویہ اور طریقہء کار کے برخلاف دشمن آپؑ کی جان لینے کے درپے ہیں۔

۵۔ دھیرے دھیرے پردے ہٹتے جارہے ہیں اور طرفین میں سے ہر ایک کے عزائم واضح ہوتے جارہے ہیں اور ایک بار پھر ایک جانب سے حق کی مظلومیت وغربت اور دوسری جانب سے باطل کی پلیدی اور خباثت ظاہر ہوتی ہے اور کربلا کا واقعہ اتم واکمل طریقہ سے حق وباطل کا حقیقی چہرہ نمایاں کرتا ہے۔

۶۔ اس طرح دشمنان اہل بیتؑ ذلیل ورسوا ہو کر اپنا حقیقی چہرہ دکھاتے ہیں اور صحرائے کربلا سے ظلم کے خلاف قیام اور مقابلہ کا ابدی چشمہ جاری ہو جاتا ہے۔ چہرے ظاہر ہو چکے ہیں۔ باطل کی ذلت ورسوائی بھی ہمیشہ کے لیے باطل نواز لوگوں کا حصہ بن چکی ہے۔

ان باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ حق وباطل کے درمیان معرکہ ناگزیر ہے۔ سطحی فکر اور ظاہر بیں نگاہ رکھنے والوں کی فکر کے برخلاف ان دونوں کے درمیان ہمیشہ کے لیے صلح ومصالحت ممکن نہیں ہے۔

ان دونوں میں کسی ایک کی جانب رجحان رکھنے والے اپنے اپنے طور پر ہر مقام اور ہر زمانہ میں اس معرکہ کو دہراتے رہیں گے۔ خیر وشر اور حق وباطل کے درمیان معرکہ آرائی یوں ہی جاری رہے گی۔

منابع:

۱۔ قرآن کریم

۲۔ابن خلدون، عبد الرحمن (۱۳۶۶)، مقدمہ، ترجمہ: محمد پروین گنابادی، جلد اول، تہران، شرکت انتشارات علمی و فرہنگی، چاپ پنجم

۳۔ آوینی، سید مرتضیٰ (۱۳۷۹)، "فتح خون"، تہران، نشر ساقی، چاپ اول

۴۔ التبریزی الشبستری (۱۳۵۹)، "اللؤلؤ النضیہ فی شرح زیارہ مولینا ابی عبد اللہ الشہید، نصر اللہ بن عبد اللہ التبریزی الشبستری"، طبع علی نفقۂ اشر کاء الا جلاؤ

۵۔ التہرتی، شیخ جعفر (۱۳۰۶ ھ ق)، "خصائص الحسین ومزایا"، بی نا

۶۔ حسینی جلالی، سید محمد رضا (بی نا)، "الحسینؑ، سماتہ و سیرتہ"، قم، دار المعروف

۷۔ الہادی (۱۴۱۲ھ) "الشیخ جعفر الہادی اخلاقیہ النہضہ الحسینیہ"، رسالہ الحسینؑ، العدد الثانی، السنہ الاولی

۸۔ توین بی، آرنولد (۱۳۵۳)، "تمدن در بوتہ آزمایش"، ترجمہ، ابو طالب صارمی، تہران، انتشارات امیر کبیر، چاپ اول

۹۔۔۔ (۱۳۷۰)، "مورخ و تاریخ"، ترجمہ: حسن کامشاد، تہران، انتشارات خوارزمی، چاپ اول

۱۰۔ جعفری، محمد تقی (۱۳۷۸)، "حق و باطل" گردآوری و تنظیم: محمد رضا جوادی، تہران، انتشارات پیام آزادی، چاپ اول،

۱۱۔ جوادی آملی، عبد اللہ (۱۳۷۲)، "شریعت در آینہ معرفت"، تہران، مرکز نشر فرہنگی رجاء، چاپ اول

۱۲۔ دری، ر۔ ھ۔ (۱۳۷۵) "فلسفہ تاریخ" ترجمہ: بہزاد سالکی، فلسفہ تاریخ (مجموعہ مقالات از دایرہ المعارف فلسفہ) بہ سرپرستی پل ادوار دز، تہران، پژوھشگاہ علوم انسانی و مطالعات فرہنگی، چاپ اول

۱۳۔ دورانت، ویل (۱۳۷۳)، "لذات فلسفہ"، ترجمہ: عباس زریاب خوبی، تہران، شرکت انتشارات علمی و فرہنگی، چاپ ہشتم

۱۴۔ رسولی محلاتی، سید ھاشم۔ (۱۳۷۷)، "خلاصہ تاریخ اسلام"، جلد سوم، تلخیص محمد علی جعفرانی، تہران، دفتر نشر و فرہنگ اسلامی، چاپ چہارم

۱۵۔ زمانی، احمد (۱۳۷۱)، "حقایق پنھانت" (پژوھشی از زندگی سیاسی امام حسن مجتبی) مرکز انتشارات دفتر تبلیغات امور چاپ دوم

۱۶۔ سروش، عبد الکریم (۱۳۷۳)، نقد و در آمدی بر تضاد دیالکتیکی"، تہران، مؤسسۂ فرہنگی صراط، چاپ چہارم

۱۷۔ عسکری، سید مرتضیٰ (۱۳۷۹)، "احیای دین"، تہران، نشر کنگرہ، چاپ دوم

۱۸۔ صدر، سید محمد باقر (۱۳۶۹)، "سنت ہای اجتماعی و فلسفہ تاریخ در مکتب قرآن"، ترجمہ و نگارش، حسین منوچہری تہران، مرکز نشر فرہنگی رجاء، چاپ اول

۱۹۔ عیوضی، محمد رحیم(۱۳۸۱)، " تاثیر عزت وافتخار حسینی برحیات و دوام انقلاب اسلامی"، تہران، انتشارات سازمان عقیدتی سیاسی نیروی انتظامی۔ معاونت سیاسی

۲۰۔ لوید، کرسیتوفر(۱۳۷۹)، "روش شناسی در تاریخ"، ترجمہ حسین علی نوذری، تہران، انتشارات طرح نو، چاپ اول

۲۱۔ مصباح یزدی، محمد تقی(۱۳۷۹)، آذرخشی دیگر از آسمان کربلا"، قم، مؤسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینیؒ چاپ اول

۲۲۔۔۔۔۔(۱۳۷۹)، " جامعہ و تاریخ از دیدگاہ قرآن"، تہران، شرکت چاپ وانتشارات بین الملل، چاپ دوم

۲۳۔ مطہری، مرتضیٰ(۱۳۶۱) ، " احیاء تفکر اسلامی" ، قم، انتشارات اسلامی

۲۴۔۔۔۔۔(۱۳۷۵)، " فلسفہ تاریخ"، جلد اول، تہران: انتشارات صدرا، چاپ ہفتم

۲۵۔۔۔۔۔(۱۳۶۸)، " قیام وانقلاب مہدیؑ"، تہران، انتارات صدرا، چاپ دہم

۲۶۔ مہاجرانی، سید عطاء اللہ(۱۳۷۵)، " انقلاب عاشورا"، تہران، انتشارات اطلاعات، چاپ چہارم